© rasailojaraid.com

بچوں کی تعلیم و تربیت

علم النفسیات کی روشنی میں

جناب ہدایت الرحمٰن صاحب محسنی ایم۔اے

روسیو کہتا ہے ''بچوں کا بہت گہرا مطالعہ کرو۔ مجھے یقین ہے تم اُن سے بالکل واقف نہیں'' اس واقفیت سے روسیو کی مراد بچوں کی انفرادی ذہنیت اور ان کے فطری رجحانات کا مطالعہ ہے ورنہ کون ماں، باپ یا اُستاد اپنے بچوں سے ناآشنا ہوتا ہے۔ بچوں کی ذہنی نشوونما اور اُفتادِ طبع کا مسئلہ ماہرین تعلیم اور معلمین کے لئے کافی اہمیت رکھتا ہے۔ ہندوستان میں بھی اس مسئلہ پر کافی غور و خوض کیا جارہا ہے۔ وارد ہا اسکیم اور اُس کے موافق و مخالف تجویزیں اور تعلیمی ترقی کے دوسرے مشورے جو آج ملک کی تعلیمی فضا میں گونج رہے ہیں سب اسی ایک تحقیق کا نتیجہ یا ذریعہ ہیں جس کی طرف فرانس کے مفکرِ اعظم روسیو نے اشارہ کیا ہی۔ یہ مشورے بطورِ خود کچھ بھی اہمیت رکھتے ہوں مگر اس میں شک نہیں کہ ان تحقیقات میں جو تشویش و تجسس چھپا ہوا ہے۔ آخر کار وہی ہمارے مشکلات کا حل ثابت ہوگا۔ حقایق کے متلاشی کے لئے علم و تحقیق کی طرف اُٹھایا ہوا ہر ایک قدم نئے رازوں کے انکشاف کا سبب ہوتا ہے۔ چنانچہ متضاد تجاویز کے خلفشار میں بھی تحقیق و تدوین کی روحِ عمل ملک و قوم کے لئے شمعِ ہدایت بنائی جاسکتی ہے یہ چھوٹا سا مضمون سپردِ قلم کرنے کا مقصد محض اسی قدر ہے کہ اشارۃً بچوں کی فطری صلاحیتوں، کمزوریوں اور ان کی تعلیم و تربیت کی وسیع ضروریات کا تذکرہ کیا جائے۔ تاکہ والدین اور معلمین کو بچوں کے گوناگوں مسائل پر سوچ بچار اور رائے قائم کرنے کا خیال پیدا ہو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور وہ مختلف الطبائع بچوں کے موافق حال راہ عمل تلاش کرسکیں۔

بچہ — بچوں کی تعلیم وتربیت سے ان کی جسمانی نشو ونما اور دماغی وروحانی ترقی مراد ہوتی ہے۔ اس لئے ماں باپ سرپرست اور اُستاد کا فرض ہے کہ وہ سنجیدگی سے اس پر غور کریں کہ کس طبیعت کے بچہ کے لئے کون سی عادات، کس قسم کے کھانے، کتنا سونا یا جاگنا، کونسی ورزشیں اور کس طرح کے مشاغل سزاوار ہوں گے۔ اپنی تحقیقات کے مطابق بچہ کی پرورش کرنا اور اس کے مفید حال ماحول پیدا کرنا ہماری اہم ذمہ داریوں کی ابتدا اور انتہا ہے تاہم تحقیقات کا یہ مسئلہ جس قدر مختصر معلوم ہوتا ہے حقیقتاً اتنا آسان نہیں ہے۔ بچہ کی انفرادی کیفیات کا اندازہ لگانے کے لئے ہمیں انسان کے تخلیقی مسلمات کا علم ضروری ہے۔ کیونکہ اصولوں سے وابستہ ہو کر ہمارا مطالعہ کافی حد تک مربوط و مکمل اور کسی قدر سہل ہوجاتا ہے اس لئے انفرادی خصوصیات سے قطع نظر اصل الاصول کے طور پر یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ انسان کی وضعی ضروریات کیا ہیں؟ مثال کے لئے سونے ہی کو لیجیے۔ انسان کو بچپن میں کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ کتنی دیر سونا چاہیے جس سے جسمانی عافیت میں کسی قسم کی خرابی پیدا نہ ہو، کم سونے سے بچوں پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں؟ اس سلسلہ میں جسمانی ساخت اور انفرادی خصوصیات کہاں تک اثر انداز ہوسکتی ہیں؟ سونے کی زیادہ اور کم ضرورت کا عادت سے کیا تعلق ہے؟ کیا سونے کی خواہش بغیر کسی نقصان کے ترک کی جاسکتی ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کے متعلقہ امور کا صحیح اندازہ کرلینے کے بعد ہی ہم بچوں پر نشو ونما کے صحیح نتائج پیدا کرسکتے ہیں اور ان کی عادات کو فطری ضروریات کے موافق ڈھال سکتے ہیں۔

علاوہ ازیں بچوں کی نفسیات، نسلی خصوصیات اور جسمانی کیفیات کا علم ہونا بھی ازبس ضروری ہے ماں باپ کی صحت اور ذاتی خرابیوں کا ذہنی ہوں یا جسمانی اولاد پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ اس کا اندازہ روزمرہ کے مشاہدات کراتے رہتے ہیں۔ انھیں مشاہدات کو تحقیقات کا ذریعہ بنا کر خاندانی مخصوصات کا فن تیار کیا گیا ہے اور یہ واقعہ ہے کہ تعلیم وتربیت کے مسائل میں بچوں کی نسلی محدودات کی رعایت ملحوظ رکھنا فطری ضروریات

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے کسی طرح کم نہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ ہندو ذات پات کی طرح اعلیٰ اور ادنیٰ پیشوں پر بھی نسلی امتیازات رسمی طور پر اثر انداز ہو سکتے ہیں نسلی واقعات کو تمثیلی مطالعہ کے منتخب کرنا اور ان کا موازنہ کرنا ہر کس و ناکس کا کام نہیں ہے اس لئے ضرورت ہے ایک خاص نفسیاتی تجربہ اور محققانہ بصیرت کی تاکہ بچوں کی حرکات کا مقررہ آئین کے ماتحت تجزیہ کیا جاسکے۔

بچپن کا سب سے زیادہ اہم تعلیمی عنصر ماحول ہے۔ ماحول کے اثرات کے بارہ میں محققین نفسیات میں کچھ اختلاف نہیں ہے۔ وہ متفقہ طور پر ماحول کی غیر معمولی اہمیت کے قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ تعلیم و تربیت کے لئے نہ صرف بچہ کو بلکہ سمجھ دار آدمی کو بھی جس اچھے ماحول کی ضرورت ہے اور کسی شے کی نہیں بچہ کو اچھا شہری بنانے کے لئے صحیح جسمانی نشو ونما کی ضرورت ہے اور اس کے قویٰ کو مضبوط رکھنے کے لئے لازم ہے کہ ابتدا ہی سے امراض اور جسمانی تکالیف سے حفاظت کا خیال رکھا جائے اگر جسم اچھا نہیں ہے تو دماغ کی فطری صلاحیت بھی نامعلوم طور پر ضائع ہو جاتی ہے قیمتی اشیاء کے لئے مضبوط تجوری کی طرح اچھے دل و دماغ کے واسطے صحتور جسم کی اشد ضرورت ہے۔ دو سے پانچ سال تک کے بچہ کا جسم بیرونی اثرات کے لحاظ سے کافی ضعیف اور نازک اور بچاؤ کی قدرتی صلاحیت سے بڑی حد تک عاری ہوتا ہے اسلئے زندگی کے ابتدائی دور میں بچوں کی کافی تعداد قسم قسم کے امراض کا شکار ہو جاتی ہے۔ یہ امراض یا تو زندگی بھر کے واسطے سوہان روح بن جاتے ہیں یا پھر زندہ رہنے کا موقع ہی نہیں دیتے اگر غور سے دیکھا جائے تو بچوں کی اس بے طرح بربادی کا باعث وہی چند افراد ہوتے ہیں جو قدرتی طور پر ان کے محافظ مقرر کئے گئے ہیں۔

امراض کی پیدائش، مدافعت کے اصولوں پر عمل پیرا نہ ہونے کا نتیجہ ہے۔ بچہ کی نشو ونما کی تاریخ کا فنی طور پر مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح ایک بچہ اگر اس کی دیکھ بھال اصولی طور پر کی جائے پیدا ہونے کے بعد برابر بڑھتا رہتا ہے اور ذرا سی بے احتیاطی کی وجہ سے اس کی ترقی یک لخت رُک جاتی ہے۔ طرح طرح کی بیماریاں پیدا ہونے لگتی ہیں اور رفتہ رفتہ اس کی کھال اور گوشت بلکہ ہڈیاں بھی بیماری کے زہریلے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اثرات کا مسکن بن جاتی ہے۔ ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ بچہ میں نشو ونما کی صلاحیت جس قدر زیادہ ہوتی ہے اسی قدر وہ غیر مناسب اثرات سے متاثر ہونے میں بھی سریع الحس ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ بچپن کی بیماریوں کے اثرات اعصاب اور اعضاء پر زیادہ زمانہ تک قائم رہتے ہیں۔ اس بنا پر ضروری ہے کہ بچوں کی جملہ ضروریات اور افعال میں ایک فن کارانہ احتیاط ملحوظ رکھی جائے۔ اُن سے متعلقہ اشیا کی فراہمی میں حفظانِ صحت کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے۔ فرنیچر۔ روشنی۔ پوشاک۔ کھانا اور ورزش وغیرہ کا انتظام بڑوں کے مقابلہ میں بچوں کے لئے زیادہ قابل غور ہے۔

پرورش کے اصول بنانے میں سب بچوں کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکنا بڑی غلطی ہے اُن سے عام معاملات میں ایک ہی قسم کا برتاؤ کرنا یا سب سے ایک ہی سی حرکات کا متوقع ہونا محض نادانی ہے جس طرح ذاتی مخصوصات میں فرق پایا جاتا ہے اسی طرح بچوں کے انفرادی تاثرات اور افعال میں اختلاف ہونا بھی ایک لازمی امر ہے اور تربیت کرنے والوں کے لئے ان تمام محدودات کا اندازہ کرنا ازبس ضروری ہے۔

عموماً تین سال کی عمر کے بعد بچوں پر خود سری اور شرارت کا دور آتا ہے۔ اس زمانہ میں بچہ اپنی سمجھ کے مطابق منتشر مشاہدات کو اپنے فکر و تخیل میں غلط سلط ترتیب دے کر اُن پر از خود عمل پیرا ہونا چاہتا ہے گویا یہ نقالی کا دور ہوتا ہے۔ اس عمر میں پند و نصائح کے بجائے بڑوں کو چاہیئے کہ خود اپنے افعال کے ذریعہ بچہ کی تربیت پر توجہ کریں۔ کیونکہ بچہ فطری طور پر بڑوں کے افعال کا نمونہ بننے کی کوشش کرتا ہے۔ بچہ کی ذات چار سال کے بعد کسی حد تک منظم ہونا اور عادات پر قائم ہونا شروع ہوتی ہی۔ اب بچہ کو طاقت اور قدرت حاصل کرنے کی خواہش اور حصول اشیا کی آرزو پیدا ہوتی ہے اس لئے وہ اپنے نظریات کے مطابق نتائج حاصل کرنے کی جدوجہد کی طرف مائل ہوتا ہے اب اُسے اس بات کی ضرورت ہوتی ہی کہ آزادانہ طور پر سعی و کوشش کا میدان اُس کے قبضہ میں ہو۔ کام کرنے کے واسطے ضروریات کی اشیاء،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فراہم ہوں تاکہ جب وہ اپنے خیالات کو عملی صورت دینا چاہے تو رکاوٹیں پیدا نہ ہوں یہی نہیں بلکہ بچہ چاہتا ہے کہ مشکلات کے حل میں بھی اس کی رہنمائی کی جائے۔ بچہ کی دماغی قوتوں اور عملی کارناموں کو وسعت اور اس کے ذہنی اُفتادات کو ترقی دینے کے لئے کھلے میدان، باغیچہ، کھیل کا کمرہ اور دیگر متعلقہ اشیاء کی جس قدر ضرورت ہے اور اُن کی فراہمی جتنی لازمی ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ یہی ماحول اور اس کی گوناگوں دلچسپیاں آگے چل کر محقق نفسیات کو بچہ کے صحیح رجحانات کا پتہ دیتی ہیں۔

گھر بچہ کی تعلیم و تربیت ایک ایسا ڈرامہ ہے جس میں اسکول اور گھر، ہیرو اور ہیروین کا کام انجام دیتے ہیں مگر کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہ دونوں یا ان میں سے کوئی ایک بجائے اچھا کردار پیش کرنے کے بُری اور قبیح افعال کے محرک ہوتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان دونوں کے سامنے لاتعداد مشکلات اور بے پایاں مصائب ہوتے ہیں جن کا حل معلوم کرنے میں وہ دیانت داری کے ساتھ جدوجہد کرتے رہتے ہیں۔ لیکن اکثر نادانی اور لاعلمی کے باعث ان کا غلط اقدام، تباہ کن اور مہلک نتائج پیدا کردیتا ہے اور بسا اوقات ہیرو، یعنی اسکول کی مشکلات ہیروئن یعنی گھر والے اپنی کم فہمی کے باعث اور بڑھا دیا کرتے ہیں۔ تربیت اطفال کے سلسلہ میں والدین کی عدم واقفیت اور نااہلیت، سماج اور ریاست دونوں کے حق میں مہلک ترین مرض ثابت ہوتے ہیں اسکول کو بچہ کی ترقی پذیر صلاحیتوں کو اُبھارنے اور پختہ بنانے کی بجائے گھر کے بُرے اثرات دور کرنے میں کافی دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور اس طرح سماج اور ریاست کی تمام قوت بچہ سے وہ بدنما داغ دھونے میں صرف ہوجاتی ہے جو بدنصیب والدین نے غلط جذبات کے ماتحت پیدا کردیئے تھے۔ اس ردعمل میں بچہ پر تازہ اور خوشنما نقش ونگار کا اضافہ مشکل ہوجاتا ہے۔ اور اُستاد کی تمام کوششیں اکارت جاتی ہیں۔ اس لئے اگر والدین عادات قبیحہ سے مختص اور شعور صحیحہ سے عاری ہوتے ہیں تو عمر کے ابتدائی پانچ سال میں بچہ میں وہ خرابیاں پیدا کردیتے ہیں جن کو سن وسال کی پختگی کم کرنے کے بجائے زیادہ سے زیادہ نمایاں کرتی رہتی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

والدین کو چاہئے کہ اپنے عمل کے ذریعہ بچہ کو سب سے پہلا سبق یہ سکھائیں کہ زندگی بھروسہ کے لائق ہے برخلاف اس کے متلون مزاج اور وہمی والدین کا نونہال اسکول جانے سے پہلے ہی اپنے دل میں یہ خیال راسخ کرلیتا ہے کہ دنیا خطرناک ۔ڈانواں ڈول اور بے اصول ہے ۔ زندگی کی بہتری اسی میں مضمر ہے کہ دنیا کے سخت اور تند اثرات سے بچو ۔ اور اہم ذمہ داریوں سے بھاگو ۔ ہر چیز کو شبہ کی نظر سے دیکھنے ہی میں حفظ ماتقدم کا راز پوشیدہ ہے ۔ بچہ کو اس بے یقینی اور بے اعتمادی سے محفوظ رکھنے میں اُستاد کو بہت کافی جدوجہد کرنی چاہئے لیکن پھر بھی مکمل کامیابی یقینی نہیں ۔ ایسے بچہ میں خود اعتمادی اور کام کا حوصلہ پیدا کرنا امر محال ہے ۔ اگر کہیں اُستاد بھی اپنے تئیں اعتماد کے قابل بن کر نہیں دکھا سکتا یعنی اپنے غصہ اور مسرت میں ایک معقول تناسب پیدا کرنے سے عاجز رہتا ہو یا اپنے عملی رویہ سے جذباتی رجحانات یکسر خارج نہیں کرسکتا ہے تو خراب شدہ بچہ کی اصلاح بالکل ہی ناممکن ہو جاتی ہے ۔

بچپن کا دوسرا پس منظر جو بے اعتمادی سے بھی زیادہ مہلک ہے اُس کا وہ مایوسانہ نظریۂ حیات ہے جس سے بچہ قنوطیت کی طرف مائل ہوتا چلا جاتا ہے ۔ وہ والدین جو ہمیشہ بچوں کی دل شکنی کرتے رہتے ہیں ،، تم کبھی درست نہ ہوگے ،، ،، تم دنیا میں کیا کرسکتے ہو ،، ،، تم فلاں جیسے کبھی نہیں بن سکتے ،، ،، تمہارا بڑا بھائی کتنا اچھا تھا تم بھلا اس کی برابری کیا کرسکتے ہو ،، وغیرہ وغیرہ وہ اپنی خواہش کے موافق بچہ میں کامرانی کا جذبہ پیدا کرسکتے ہیں نہ اس کو ناکامی سے ڈرا سکتے ہیں ۔ اس کے برخلاف وہ بچہ میں اس کی کمتری کا یقین ہیچ میرزی کا احساس پیدا کردیتے ہیں اور رفتہ رفتہ بچہ کو کم نظر ، سہا ہوا لا دو بیل بنا کر چھوڑتے ہیں پھر وہ کوئی کام بھی خوف وہراس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں کرسکتا ۔ ایسے بچہ کے بارہ میں اُستاد کی ذمہ داری بہت دشوار ہو جاتی ہے ۔ اب اُن میں خود اعتمادی پیدا کرنا یا کام کی عادت برقرار رکھتے ہوئے اس کے دماغ سے خوف کا عنصر جدا کردینا سہل کام نہیں ہوتا ۔ فطرت ثانیہ کبھی فنا ہوتی ہے اور کبھی اس طور سے جاتی ہے کہ نہ مرض

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رہے نہ مریض یعنی بچہ کو سرے سے کام ہی سے نفرت ہو جاتی ہے اور وہ تعلیم کو ناقابلِ حصول سمجھ کر پڑھنے لکھنے سے بھی یکقلم متنفر ہو جاتا ہے۔

اتنی ہی مہلک ایک اور خرابی بھی ہے جس کا اکثر والدین اپنے بچہ کو شکار بنا دیا کرتے ہیں یہ ہر بات کو اصولِ منفعت سے جانچنے اور خودغرضانہ نظریۂ حیات رکھنے والے والدین کے ماحول کا نتیجہ ہوتی ہے ایسے گھر کا تربیت یافتہ بچہ بغیر انعام کے وعدے کے ایک قدم چلنے سے بھی عاری ہوتا ہے۔ یہ بچہ پانچ سال کا ہوتے ہوتے اپنے اس نظریہ پر اس قدر سختی سے کاربند بنا دیا جاتا ہے کہ وہ کام کی عظمت سمجھنے سے بالکل قاصر ہوتا ہے۔ اُس کے لئے ہمدردی، رحم وکرم، اور ایثار بے معنی لفظ ہوتے ہیں۔ وہ سمجھ لیتا ہے کہ اچھائی کی بات وہ ہے جو حصول زر میں معاون ہو اور بُرائی کی بات صرف وہ ہو سکتی ہے جو ذاتی منفعت سے مانع ہو۔ اس کے فلسفہ اخلاقیات کا اوّل اور آخر بس وہی ایک ذاتی مفاد کا خیال ہو۔ ایسے بچّے اصلاح اور تربیت کے معاملہ میں اُستادوں کو بالکل مایوس کر دیتے ہیں اور اُن پر اخلاقی ترقی کے نشانات ایسے دھندلے ہوتے ہیں کہ نہ ہونے کی برابر نظر آتے ہیں۔ تاہم ان بچوں سے شکستہ خاطر نہ ہونا چاہئے۔ خلوص اور ہمدردی کے برتاؤ سے ان کی مادیت روحانیت کی طرف لائی جا سکتی ہے اور یوں بھی یہ بیماری نفسیاتی طور پر قابلِ رحم ہے

نادان والدین کی خامیوں کا عام شکار اور سب سے زیادہ خستہ حال اور قابلِ رحم وہ بچہ ہوتا ہے جس پر ضرورت سے زیادہ مادرانہ شفقتوں کا طومار رہا ہو۔ مادرانہ نوازشوں کے زیراثر اُس کا یہ خیال لقین کی حد تک پہونچ جاتا ہے کہ نااہل ہونا اور دوسروں سے آسائش کا طالب ہونا ہی کامرانی کا گُر ہے۔ بلکہ لفظی طور پر نااہلیت کا اقرار کر لینا کام سے بچنے کی سہل ترین ترکیب بھی ہے۔ وہ سمجھنے لگتا ہے کہ تھوڑی دیر کی منت اور خوشامد نہ صرف فائدہ مند ثابت ہوتی ہے بلکہ لجاجت سے سامع کے خلوص و محبت میں بھی استواری پیدا ہو جاتی ہے۔ نادان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ سب حربے محبت کی ماری بیوقوف ماں پر ہی چل سکتے ہیں۔ دنیا کی سخت دلی اُن کی کفیل نہیں ہو سکتی۔ اس قسم کے بچہ کو جدوجہد سے روشناس کرانا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وہ اُستاد کی نظرِ عنایت بھی اُنھیں ہتھکنڈوں سے حاصل کرنا چاہتا ہے جن سے اُس نے ماں کو رام کئے رکھا ہے سختی اور داروگیر بھی اس کی اصلاح میں عاجز ہیں۔ لاڈ کے بگاڑے ہوئے بچہ پر عملاً ظاہر کرنا چاہئے کہ دنیا میں سہارے کی زندگی سے بہتر ایک زندگی ہے جو خود اعتمادی اور ذاتی سعی و کاوش سے حاصل ہوتی ہے۔

والدین کے اثر سے قبول کی ہوئی قبیح عادتوں میں سے ایک عادت حریفانہ ذہنیت ہے۔ ہر شخص سے اپنا مقابلہ کرنا اور سب پر اپنی فوقیت کا اظہار کرنا کسی طرح شجاعت یا اعلیٰ حوصلگی کے مرادف نہیں۔ ہمچومن دیگری نیست کا خبط انتہائی بیوقوفی اور اس کا اظہار پرلے درجہ کی حماقت ہے۔ انسانیت کی تاریخ شاہد ہے کہ ایک شخص میں خواہ وہ کتنا ہی یکتائے روزگار ہو ہر قسم کی برتری کا ہونا بعید از قیاس ہے۔ ہر اچھی شے پر خود قابض ہونے کی کوشش اور دوسرے کی ہر بات کو اپنے سے حقیر جاننا بے معنی حرص اور تخریب کی عادت پیدا کر دیتا ہے۔ حریفانہ ذہنیت کے بجائے اگر اتحادِ عمل کا جذبہ پیدا کیا جائے تو انفرادیت کے ساتھ اجتماعیت کی بیل بھی پروان چڑھ سکتی ہے اور یہی ساجی زندگی کا نچوڑ ہے۔ لیکن جہاں بچہ صبح و شام ماں یا باپ کو اپنے کارنامے زوردار الفاظ میں اس طرح بیان کرتے ہوئے سنتا ہو جس میں اپنی بڑائی کے ساتھ ساتھ دوسروں کی تحقیر بھی شامل ہو وہاں ننھے سے دل پر ان اثرات کے گہرے نقوش کا پیدا ہو جانا کیا بعید ہے بیجا خودستائی اور شیخی کی باتوں سے انفرادی آزادی کے بارہ میں بچہ کا تخیل بالکل تباہ ہو جاتا ہے اور پھر والدین کی لفظی نصیحت کہ "فلاں کام نہ کرو"، "بڑوں سے گستاخی نہ کرو"، "چھوٹے بھائی کو مت مارو" وغیرہ وغیرہ بالکل بے معنی ثابت ہوتی ہے۔ بچہ بیباکانہ خودستائی کے سامنے والدین کو بھی اپنے سے پیچھے سمجھنے لگتا ہے اور اُن کے ہر ایک مشورہ کو حقارت سے دیکھتا ہے۔ جس کا نتیجہ انتہائی خودسری اور بدنظمی کی صورت میں رونما ہوتا ہے ایسے بچہ میں نہ امدادِ باہمی کی روح پائی جاتی ہے اور نہ قومیت اور شہریت کے مفاد کا جذبہ۔ کیونکہ اُسکی انفرادی بیباکی بہبودِ عام اور اجتماعی مفاد کی پابند ہونے کی صلاحیت کھو بیٹھتی ہے۔ اپنے انوکھے تجربات اور والدین کی عملی تربیت کے خلاف، بچہ کو یہ سمجھانا کہ سچی آزادی دوسروں کے حقوق غصب کرنے میں نہیں بلکہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ذاتی حقوق حاصل کرنے اور اُن کو مناسب موقع پر استعمال کرنے میں پوشیدہ ہے اس کی نظر میں ایک فریب سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔

اسکول تعلیم کے نظریات کے ساتھ حصولِ علم کے ذرائع بھی برابر بدلتے رہتے ہیں۔ چنانچہ دنیا کے بدلتے ہوئے رنگ ڈھنگ کا اقتضا ہے کہ وقتی ضروریات کے اعتبار سے تعلیم کے طریقوں اور نصاب کے اصولوں میں ترمیم کی جاتی رہے۔ یہی وجہ ہے کہ زمانہ کے رجحانات کے موافق تعلیمی دنیا میں بہت کچھ تبدیلیاں کی جاچکی ہیں اور روز بروز کی جارہی ہیں۔ بہت سی نئی مشکلات کا احساس ہوچکا ہے اور بہت سی پرانی مشکلات کے حل معلوم کرلئے گئے ہیں کچھ مشکلات ایسی ہیں جو اب بھی اربابِ حل و عقد کے لئے غور و فکر کا باعث ہیں۔ ان مسائل کی اہمیت سمجھنے میں ہندوستان اکثر باعتبار ملکوں سے پیچھے ہے۔ تاہم یہ کہنا بیجا ہوگا کہ یہاں تعلیمی ضروریات اور موجودہ نظامِ تعلیم کی خام کاریاں قیودِ احساس سے باہر ہیں۔ تعلیم کا جدید نظریہ اب یہ ہرگز نہیں کہ صرف دریافت شدہ معلومات اور مکتوبہ مسلمات سے ہی طلبا کو روشناس کرادیا جائے۔ بلکہ درسگاہوں کی کوشش یہ ہے کہ طالب علم کی غور و فکر کی قوتوں کو زیادہ سے زیادہ صیقل کیا جائے تاکہ ماضی کے علم پر تکیہ کرلینے سے جدید معلومات کے دروازہ بند نہ ہوجائیں۔ پھر موجودہ علوم میں بھی اس قدر انواع و اقسام مرتب کئے جاچکے ہیں کہ سب پر عبور حاصل کرلینا کسی فردِ واحد کی استعداد سے باہر ہے۔ کیونکہ مختلف علوم میں اتنے عمیق اختلافات پائے جاتے ہیں کہ ایک شخص کے لئے خواہ وہ کتنا ہی ذہین کیوں نہ ہو ہر علم میں یکساں دلچسپی پیدا کرلینا ممکن نہیں اس کے لئے شخصی رجحانات اور ذاتی صلاحیت معلوم کرنیکی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ آجکل ابتدائی مدرسوں کے اُستادوں کا بڑا کام یہی سمجھا جاتا ہے کہ وہ طالب کی پوشیدہ صلاحیتوں سے واقفیت حاصل کریں اور انھیں اپنی اپنی ذہنی قوتوں کے برمحل استعمال کی طرف متوجہ کریں اس بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ معلمی کا پیشہ کچھ ایسا آسان کام نہیں ہے۔ طبعی صلاحیت کی جستجو اور صحیح تربیت کا اہتمام اُستاد میں عظیم الشان نفسیاتی تجربہ چاہتا ہے جس میں یہ نہیں وہ اُستاد بننے کے لائق نہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بچہ کو اس کے فطری رجحانات کے خلاف تعلیم دلاکر ایک ادنیٰ کام کرنے والا بنایا جاسکتا ہے مگر اس کی اصلی ذہانت سے ہرگز فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا۔ سماج کی ترقی پذیر ضروریات اسی وقت پوری ہوسکتی ہیں جب ہر شخص سے اس کے پورے ظرف کے مطابق کام لیا جائے حقیقتاً ہمارا یہ کام یورپ کے صنعتی اور میکانکی کاموں سے کہیں زیادہ اہم ہے انسان نفسیات سے زیادہ مستفید ہونے کا یہی خیال پرانے دارو گیر اور جبر کے فلسفہ کو بھی ناکارہ بنا دیتا ہے۔ سزا سے ہم بچہ کو خوفزدہ بناتے ہیں اور خوف کے ذریعہ وہ کام لینا چاہتے ہیں جو بچہ کرنا نہیں چاہتا یہی وجہ ہے کہ ایسا کام کامیابی کے اعلیٰ میار سے ہمیشہ محروم رہتا ہے۔ اس کے علاوہ موجودہ دور میں جسمانی سزا جرم کے تدارک کا ذریعہ اور مجرم کی اصلاح کا باعث بھی نہیں سمجھی جاتی کیونکہ ظلم و تعدی مظلوم کے صحیح رجحانات کو خوف کے پردے میں چھپا دیتے ہیں۔ جس سے تدارک تو کیا جرم کے اسباب کا صحیح تجزیہ یہ بھی ناممکن العمل ہوجاتا ہے۔ اُستاد کا فرض تو یہ ہے کہ وہ بچوں کے نفسیات کا گہرا مطالعہ کرے اور طلبا کے جملہ افعال کو انفرادی خصوصیات کے آئینہ میں تلاش کرے ایسا کرنے سے اُس پر روشن ہوجائے گا کہ بچوں کے وہ تمام افعال جن کو جرائم کی مہلک نوعیت تصور کرلیا جاتا ہے ان کے دماغ پر ناقابل قبول بوجھ ڈالنے کا نتیجہ تھے یہ سمجھ لینا کہ دماغ ایک ایسا برتن ہے جس میں ہر سیال اور غیر سیال شے بقدر ظرف بھری جاسکتی ہے انتہائی غلطی ہے۔ اس کے برخلاف دماغ کو ایک ایسا ظرف سمجھنا چاہئے جس میں تین ایسے خانے بنے ہوں جن میں مخصوص پیمائش اور مخصوص ساخت کی اشیا ہی داخل ہوسکتی ہیں۔ اُن تین چیزوں کو قوتِ فکر۔ جذباتی کیفیات اور قوت عمل تصور کرنا چاہئے۔ ذہنی صلاحیت کا دار و مدار انہی تین قوتوں کے تناسب پر مبنی ہے۔ انفرادی طور پر ان کے افعال میں زمین و آسمان کا فرق ہے مثال کے طور پر فہم کی خاصیت ربط و تلازم پیدا کرنا۔ جذباتی کیفیات کا اقتضا، جوش و خروش، غیظ و غضب اور رحم و کرم کے جذبات اُبھارنا۔ اور قوتِ عمل کا نتیجہ حرکت ہے۔ جب ان تینوں میں فرداً فرداً اتنا فرق ہے تو ان کے مختلف مرکبات میں کتنا اختلاف ہوگا۔ یہ سب کیفیات اپنی اپنی جگہ افعال اور خصائص کے اعتبار سے غیر متزلزل اور قایم بالذات ہیں۔ ایک کے لئے جو فعل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نظری ہے دوسرے کے لئے قطعی ناممکن۔

اس لئے اگر اسکول کی ہر جماعت میں نفسیاتی نقطۂ نگاہ سے، دماغی مخصوصات کے آٹھ دس نمونے موجود ہوں جو انفرادی طور پر یقیناً جداگانہ صلاحیتوں کے مالک ہوں گے تو تعلیمی نصاب میں بھی اتنی ہی جداگانہ راہوں کی ضرورت ہے۔ لیکن یہ اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک طریقۂ امتحانات کی شدت پسندی کو کم نہ کر دیا جائے۔ اس صورت میں اساتذہ کو طلبا کا غیر ضروری بوجھ اس طرح ہلکا کرنا چاہیئے کہ وہ اپنے طرز تعلیم کو بچوں کے انفرادی رجحانات سے مطابقت دیں اور پڑھانے میں تعلیم کے بجائے اغراض تعلیم کو اپنا حقیقی مقصود تصور کریں۔ پڑھانے والوں کو اس ضروری اصلاح کا احساس ہونا لازم ہے۔ ممتحنین کی جماعت تو اغراض تعلیم کے صحیح اندازہ سے بالکل عاری معلوم ہوتی ہے۔ اُستادوں کو اپنے اپنے فرائض کی انجام دہی کے طریقے خود ہی غور و خوض اور تحقیق سے معلوم کرنے چاہئیں اور پھر اُن پر عمل پیرا ہونا چاہیئے۔ ان کے فرض منصبی کی ادائگی کے لئے اس وقت تک نہ تو صحیح اصول موجود ہیں اور نہ اُن سے آگاہ کرنے والے ہی۔ اگرچہ اکثر ممتحنین خود بھی اُستاد ہوتے ہیں مگر بحیثیت ممتحن ترقی پسند اُستادوں کے لئے رکاوٹ اور دشواری کا باعث بن جانا اُن کا غیر شعوری فعل ہے۔ ممتحنین اور اُستادوں کے نظریات کا متحد ہونا بہت ضروری ہے بلکہ تعجب کی بات ہے کہ جب اُن کا مقصود ایک ہے یعنی مناسب اور متمدن دماغ پیدا کرنا تو پھر اس باہمی خلفشار کے کیا معنی ہو سکتے ہیں۔

ذہنی نشو ونما اور بچہ کی اُٹھان کے اعتبار سے تعلیم و تربیت کا خیال کم عمری ہی سے ہونا چاہیئے کیونکہ پانچ سات سال کی عمر ہوتے ہوتے بچہ نگہداشت کے بغیر کافی خراب عادتیں اختیار کر چکا ہوتا ہے۔ یہ تعلیم اگرچہ اُستادوں ہی کے زیر اثر ہونا چاہیئے مگر اُستادوں کا ماحول اسکول کے بجائے نرسوں اور اتالیقوں سے ملتا جلتا ہونا ضروری ہے اس قسم کے اسکولوں کو پرورش گاہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ ان پرورش گاہوں کو بچوں کے اُن رجحانات کا خاص خیال رکھنا چاہیئے جو نفسیات کے ماہر کے لئے اہم سمجھے جاتے ہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بچوں کو کتابوں سے نہیں بلکہ مختلف مادی اشکال اور خاکوں کے ذریعہ معلومات سے آگاہ کرنا چاہیئے پھر آگے چل کر لکھائی پڑھائی کے اسکولوں اور ثانوی تعلیم کے مدرسوں میں بھی زیادہ فرق نہ ہونا چاہیئے۔ فطری رجحانات میں رکاوٹ پیدا کرنے والی کوئی تعلیم یا طریق تعلیم اختیار کرنا محض بے کار ہے۔ بچہ کا شوق سے نہ پڑھنا عام طور پر استاد یا نصاب کی خامی ہے اور اس کا ازالہ معلمین کا فرض ہے۔ تشدد اور دار و گیر کا اصول پڑھانے والوں کی کمزوریوں کا ثبوت اور بچوں کے فطری نقوش ذہانت کی تباہی کا آلہ ہے تعلیم کی بڑھتی ہوئی اہمیت کے ساتھ ثانوی تعلیم کی قدر و قیمت اور ضرورت بہت بڑھ گئی ہے لیکن افسوس ہے کہ ہمارے ملک میں سب سے زیادہ یہی دورِ تعلیم ناکارہ اور غلط ہے۔ بچوں کو ان کے موافق حال تعلیم سے مزین کرنے کے بجائے ان کے دماغوں میں کتابوں اور فارمولوں کی ایک مقررہ تعداد اتار دی جاتی ہے جو ۹۹ فی صدی محض بے کار ثابت ہوتی ہے۔ کیونکہ بچوں نے اپنی اپنی صلاحیت اور ضرورت کے موافق تعلیم کے اہم رموز سمجھ کر حاصل نہیں کئے ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ حقیقی استفادہ سے محروم رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس مسئلہ میں بڑی قطع و برید اور رد و بدل کی ضرورت ہے۔ اس کی پیچیدگیاں اور مشکلات ہمارے محدود بیان سے کہیں زیادہ بڑھ کر ہیں۔ جمہوریت پسند ملک میں ہر ہر بچہ کے لئے تعلیم و تربیت کی ایک سی سہولتوں کا مہیا ہونا ضروری ہے کسی خاص گروہ کے مفاد کے لئے دوسرے طبقات کو غیر معمولی مصائب یا دشواریوں کا شکار بنا دینا تعلیمی مسئلہ کا درست حل نہیں ہے۔ مگر عام طور پر یونیورسٹیوں کا لائحہ عمل اسی اصول پر بنایا گیا ہے۔ یہ مانتے ہوئے بھی کہ یونیورسٹی کی اعلیٰ تعلیم ہر شخص کی خلقی ضروریات سے باہر ہے۔ ثانوی تعلیم کو محض اس لئے ایک خاص ڈھچر پر قائم کیا گیا ہے کہ وہ یونیورسٹی کی اعلیٰ تعلیم سے منسلک کیا جا سکے۔ عوام کی بہبود کے خیال سے ثانوی تعلیم کو، بجائے خود مستحکم اور مکمل بنانے کی ضرورت ہے۔ اگرچہ ہم اس بات کو نظر انداز نہیں کر سکتے کہ چند طلبا کو جو اعلیٰ تعلیم کے واقعی اہل ہوں اس تبدیلی سے کس قدر نقصان پہونچیگا اور ملک و قوم کے واسطے اعلیٰ تعلیم بھی حاصل کرنے کے لئے علم و فضل ضروری ہیں تاہم اعلیٰ تعلیم نہ پا سکنے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

والے بچوں کی اکثریت کے حقوق کا خیال ہر طرح زیادہ توجہ کا مستحق ہے۔ اس کا واحد حل یہی ہو سکتا ہے کہ انفرادی نظریۂ تعلیم اور حصول علم کے ذاتی وسائل کو زیادہ سے زیادہ وسعت دیدی جائے اور جماعت میں بیٹھ کر تعلیم حاصل کرنے کا تشدد آمیز اور دقیانوسی طریقہ کار ختم کر دیا جائے۔ یہ سب کوئی وہمی مشورہ یا اچھوتا خیال نہیں ہے بلکہ اسی نظریہ کے ماتحت یورپ اور امریکہ کے مختلف الاصول اسکولوں میں تجربے کئے جا رہے ہیں اور وہ نمایاں حد تک کامیاب ثابت ہو رہے ہیں۔ یہ اُمید کی جا سکتی ہے کہ بہت قریبی مدت میں ان کی کامیابی کے نتائج پُرانے طرز کے اصولوں کو اپنے نقش قدم پر چلنے کے لئے آمادہ کر دینگے۔

بچہ کی صحیح تعلیم و تربیت میں سب سے بڑی مشکل گھر اور اسکول کے مختلف احول کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اس مشکل کا حل یہی ہو سکتا ہے کہ والدین اور اساتذہ ایک دوسرے کی ذمہ داریوں کا احساس کرتے ہوئے عملاً متحد ہو جائیں۔ شاید اس اتحاد سے اختلاف تو کسی کو بھی نہ ہوگا تاہم عمل میں کوتاہی کے نتائج ہمارے سامنے موجود ہیں۔ ایک طرف والدین جذباتی طور پر پدرانہ اور مادرانہ شفقتوں کا بخوبی مظاہرہ کرتے ہیں اور دوسری طرف بیچارہ اُستاد بچہ کی نفسیاتی ترقی کے مطالعہ اور سعی میں وقت گنواتا ہے۔ جن خرابیوں کی تشکیل کا باعث والدین ہوتے ہیں اُستاد انہی کی تخریب کرتے ہیں اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے مطمئن نہیں ہوتے بلکہ حریفانہ خیالات کا مظہر ہو جاتے ہیں۔

والدین کو شعور پذیر بچوں کی نفسیاتی مشکلات کا اندازہ لگانا چاہئے۔ عام طور پر وہ یہ غلطی کرتے ہیں کہ بہت جلد اپنے بچوں سے پورے سمجھ دار لوگوں کا سا برتاؤ شروع کر دیتے ہیں۔ اور اس طرح ان کے کاندھوں پر وہ بوجھ لادنا چاہتے ہیں جس کے برداشت کرنے کے وہ کسی طرح اہل نہیں ہوتے۔ والدین کو اس امر کا پورا خیال ہونا چاہئے کہ بچے ان کے اہم اور جزوی خیالات کی کتابوں اور اُستاد کے بتائے ہوئے الفاظ سے کہیں زیادہ قدر کرتے ہیں۔ اور وہ گھر سے باہر ہو کر اُن تمام گروں کو جو والدین نے ان کے ذہن نشین کرا دیئے ہیں جذباتی اور فطری طور پر یاد رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لہٰذا والدین کے لئے اپنی ذمہ داری کا احساس بہت ضروری ہے اگر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

غیبت کی مذمت کرنے کے بجائے والدین نے تلاش وجستجو سے ہمسایہ کے خلاف تھوڑی تھوڑی باتوں میں زہر اُگلا ہوگا اور نادانستہ طور پر بچوں کو بھی عیب جوئی پر لگایا ہوگا تو اُستاد غیبت اور کسی کے پیٹھ پیچھے بُرائی کرنے کو کتنا ہی بُرا بتائے، اس پر کتاب کی تمثیلات سُنائے اُس کے باوجود بچہ پر اس فعل کی قباحت ثابت کرنا بہت دشوار امر ہے۔ بچہ اخلاق اور راست بازی کی ضرورت صرف اس قدر سمجھے گا کہ وہ اس قسم کی گفتگو کرتے ہوئے اپنے شفیق والدین کی بتائی ہوئی رازداری پر عمل کرے۔ یعنی ہمسائے کے سامنے ایسی بات منہ سے نہ نکالے صرف ان کے پیچھے ہی کہی جاسکتی ہے۔ اس کے علاوہ والدین کو بچوں کے ساتھ دورُخی یا فریب کی بات نہ کرنی چاہئے۔ اور نہ اُن پر یہ ظاہر ہونے دینا چاہئے کہ وہ کوئی بات بچوں سے چھپا رہے ہیں۔ اسکے برخلاف ضروری ہے کہ صرف دکھانے کے لئے نہیں بلکہ حقیقتاً بچوں سے اخلاص سادگی اور صفائی کا برتاؤ ہی روا رکھا جائے۔

بچپن کی خراب عادتوں کے پیدا ہوجانے کے بعد بھی اگر ناتجربہ کار والدین استاد کے ساتھ تعاون کرلیں اور اُس کے مشورہ سے بچوں کی اصلاح کی کوشش کریں تو بہت کچھ کامیابی کی اُمید کی جاسکتی ہے۔ ماں باپ اور اُستاد کے متفقہ فیصلے کے سامنے اس بات کا بہت کچھ امکان ہے کہ بچہ اپنی بیجا عادتوں سے گریز کرنے لگے۔ کیونکہ اس کو اپنی غلطی کا اعتراف کرنے میں زیادہ تامل اُس وقت ہوتا ہے جب وہ والدین اور اُستاد کے افعال واقوال میں بیّن فرق دیکھتا ہے اور اُن میں سے کسی ایک کو دوسرے کے سامنے حریفانہ طور پر صف آرا پاتا ہے یا اُن کے اختلافات سے اپنے مطلب کے موافق معنی آفرینی کرسکتا ہے۔

عام اُستادوں اور والدین کے علاوہ بچوں کے افعال وکردار کی تاریخ سے طبعی رجحان کا اندازہ لگانے کے لئے ہر اسکول میں نفسیات کے ماہروں کے تعاون کی بھی ضرورت ہے جو والدین اور اُستادوں سے مل کر بچوں کی حرکات کا تجزیہ کریں اور پھر اُن کے موافق حال لائحہ عمل تجویز کریں۔

بچوں کی جذباتی کیفیات کو اب تک تمام اسکولوں اور درسگاہوں میں نظرانداز کیا جاتا رہا ہے۔ حالانکہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عام دلچسپی کے فنون خاص طور پر نصاب میں داخل ہونے ضروری تھے۔ ڈرامے، تقاریر، نظم خوانی۔ موسیقی (خواہ گانا ہو یا ساز) اور فوجی کھیل کود وغیرہ ایسے فنون ہیں جن میں بچہ بڑی دلچسپی سے مہارت حاصل کر سکتے ہیں اور انہی سے آج تک اسکولوں کا نصاب خالی رہا ہے اخلاقی ڈراموں کی اداکاری بچوں کے لئے نہ صرف ڈراموں کو ادبی حیثیت سے روشناس کرانے کا ذریعہ ہے بلکہ اس سے بچے خود ہی اچھے اور برے کیرکٹروں سے بہت کچھ عملی سبق حاصل کر سکتے ہیں۔ اور یہ کھیل کے نقوش ان کے دلوں پر بہت گہرا اثر کرتے ہیں اس کی ضرورت نہیں کہ ان کے لئے خاص ڈرامے تیار کئے جائیں۔ بلکہ ڈرامے تو چھٹپنے میں ان کی استعداد سے بہت بالا ہوں گے معمولی سبق آموز روزمرہ کے اسباق کو ڈراموں کی صورت میں پیش کیا جاسکتا ہے۔

بچوں کی تعلیم میں سائنس کی موجودہ ایجادوں میں سے ہر وہ شئے داخل ہونی چاہئے جو تعلیم اور مشاہدے میں سہولت سے استعمال کی جاسکتی ہے کیونکہ ایسا کرنے سے بچوں کو جدید معیار زندگی کے سامنے لاکر کھڑا کیا جاسکتا ہے اور ان اشیاء کے بارہ میں انھیں بلا واسطہ معلومات ہو جاتی ہیں۔ نظام لاسلکی اور ریڈیو کا اسکول میں مکمل انتظام ہونا چاہئے یہ چیزیں ہماری زندگی کا اہم ترین عنصر بن چکی ہیں اور ان کی اہمیت کسی طرح بھی کتابوں سے کم نہیں ہے۔

اسکول کی چار دیواری جو بچوں کے لئے قید خانہ کی سی حیثیت رکھتی ہے مختلف قسم کی کارآمد دلچسپیوں کے ذریعہ بہت کچھ جاذب توجہ بنانے کی ضرورت ہے۔ اور اصول تعلیم اور ذریعہ تعلیم کی یہی وہ تبدیلی ہے جس کی طرف عملی قدم اٹھانا مبلغانِ تعلیم اور مصلحانِ قوم کا اوّلین فرض ہے۔

© rasailojaraid.com